مابعد صنعتی معاشرہ اور اسلام

پروفیسر عبدالمغنی

مابعد

صنعتی معاشرہ اور اسلام

۱۷۶۰ء کے قریب انگلستان میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا اور صرف چالیس سال کے اندر اس نے معاشرے کو اس حد تک بدل دیا کہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں ہی حساس لوگوں کو محسوس ہونے لگا جیسے عالم انسانیت پر کوئی آفت نازل ہوگئی ہو۔ چنانچہ ۱۷۹۸ء میں ورڈزوتھ اور کولرج کی نظموں کا جو مجموعہ LYRICAL BALLAD کے نام سے شائع ہوا اس میں یہ احساس بہت نمایاں ہے۔ ورڈزوتھ کی فطرت پرستی درحقیقت زندگی پر صنعت کے بڑھتے ہوئے غلبے کا ایک ردعمل تھا۔ اس شاعر نے ایک "موسم بہار کی ابتدا میں لکھے ہوئے اشعار" کے ذریعے یہ تاریخی سوال اٹھایا "انسان نے انسان کی کیا گت بنائی ہے؟" مطلب یہ ہے کہ آلات اور برق و بخارات نے مل کر اقتصادی و معاشرتی نیز جغرافیائی حالات میں جو زبردست تبدیلیاں کیں وہ انسان کا اپنا ہی کارنامہ ہے۔ ان تبدیلیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ آدمی کی معصومیت اور سادگی ختم ہوگئی اور

تمدن کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں نے تہذیبی قدروں کو پامال کرنا شروع کیا۔

انگلستان کا صنعتی انقلاب سو سال تک روئے زمین کا نقشہ اور سماج کا نہج بدلتا رہا۔ معیشت کی ترقیات نے سماج کے اندر نت نئی الجھنیں پیدا کیں۔ انسان فقط ایک مشین کا پرزہ بن کر رہ گیا۔ ۱۸۷۰ء میں وفات پانے والے انگریزی ناول نگار، چارلس ڈکنز نے اپنے ناول "اولیور ٹوئسٹ" میں دکھایا کہ سماج کے اندر انسان کا استحصال اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ کم سن بچے بھی مشینوں کا ایندھن بنائے جانے لگے ہیں اور جرائم کی رفتار روز افزوں ہے، لہٰذا دنیا "ہارڈ ٹائمز" (مشکل وقت) سے گذر رہی ہے، جو اس کے دوسرے ناول کا عنوان ہے۔

صنعتی انقلاب کی تکمیل نے انیسویں صدی میں انگلستان اور یورپ کے معاشرے میں مکمل انقلاب برپا کر دیا۔ تحریک اصلاح نے سولہویں صدی عیسوی ہی میں سماج پر مذہب کی گرفت ڈھیلی کر دی تھی بلکہ اجتماعی معاملات سے مذہب کو بے دخل کر دیا تھا۔ چرچ اور اسٹیٹ کی کش مکش میں ریاست جیت گئی اور گرجا کو عبادت تک محدود کر دیا گیا۔ زندگی خدا اور بادشاہ کے درمیان تقسیم ہو گئی، خدا کا حصہ خدا کو اور بادشاہ کا حصہ بادشاہ کو الگ الگ دے دیا گیا۔ مذہب فقط پرائیوٹ معاملہ بن گیا اور پبلک لائف اس سے بیگانہ ہو گئی، حالانکہ تحریک اصلاح کا مطلب کلیسا کے اندر اصلاح تھا اور اس سے لوگوں کے اخلاق کی درستگی مقصود تھی،

لیکن اس کا نتیجہ رائج الوقت مذہبی نظام سے بغاوت کی شکل میں نکلا۔
مذہبی احتجاج PROTESTANTISM اور تطہیر PURITANISM
تحریکات کو جس واقعے نے پہلے ریاست، پھر پورے سماج کو لادینیت
SECULARISM کے آغوش میں ڈال دینے کی طرف موڑ دیا وہ سولہویں
صدی میں فروغ پانے والی مغربی نشأۃ ثانیہ کی وہ ہمہ گیر تحریک تھی جو
علوم وفنون اور ادبیات کی دنیا میں چودھویں صدی عیسوی سے ہی شروع
ہو چکی تھی۔ اس تحریک کا اصل محرک تو عہدِ وسطیٰ میں، جو یورپ کی تاریخ
کے مطابق ۴۷۶ء سے ۱۴۵۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ
عیسائیوں کا وہ قریبی رابطہ ہے جو گیارھویں سے تیرھویں صدی عیسوی تک
صلیبی جنگوں کے درمیان ہوا اور مسلم ہسپانیہ کے ساتھ تعلقات کے علاوہ
اس رابطے سے بھی قدیم یونان و روم کے علوم وفنون کی کتابیں بالعموم عربی
زبان میں، جو عہدِ وسطیٰ کی واحد بین الاقوامی زبان تھی، اہلِ مغرب کے ہاتھ لگیں،
مگر مذہبی عناد، سیاسی کش مکش اور جنگی مقابلے کے سبب یورپ کے تنگ نظر
علماء نے آج تک عربوں اور مسلمانوں کے اس احسان کا اعتراف اور عطیے
کا اقرار گوارہ نہیں کیا ہے۔ اس کے بجائے انہوں نے براہ راست قدیم
یونان و روم سے اپنا ذہنی و اخلاقی رشتہ جوڑ رکھا ہے، چنانچہ اسرائیلی
خرافات اور یونانی و رومی صنمیات نے مل کر مغربی معاشرے کا وہ
اساطیری ڈھانچہ بنایا اور سانچہ تیار کیا جو عہدِ جدید کے آفتاب کی پہلی کرن
پڑتے ہی پگھل گیا اور اس کی اصلاح کی کوشش نے ہی اس کے اندر

انتشار پیدا کر دیا۔

بیسویں صدی صنعتی انقلاب کے بعد کا دور ہے، جس میں یورپ اور امریکہ نے ہر قسم کے صنعتی آلات سے مسلح ہو کر قدم رکھا اور ان بر اعظموں میں سائنس کی خالص مادی ترقیات نے ٹکنو لوجیکل اور نیوکلیر معاشرے کو جنم دیا۔ اس معاشرے کی برق رفتاری نے صدی کی دوسری ہی دہائی میں عصر حاضر کو ۱۸-۱۹۱۴ء میں پہلی اور پانچویں دہائی میں ۳۹ء سے ۴۵ تک دوسری جنگ عظیم کا مژدہ سنایا، جبکہ صدی کے دوسرے نصف کا ہر سال گذرے ہوئے سال سے آگے بڑھ کر تیسری جنگ عظیم کے خطرے سے دنیا کو قریب تر لاتا نظر آتا ہے۔ ماضی کی عالمی جنگوں کے اثرات ہولناک ہونے کے باوجود محدود رہے، لیکن مستقبل کی جنگ کی متوقع ہلاکت خیزیوں کے تصور ہی سے آج کی انسانیت لرزہ براندام ہے، اس لیے کہ وہ بحر و بر کی وسعتوں سے نکل کر فضاؤں پر محیط ہوں گی اور زمین کا کوئی خطہ ان کی تباہ کاری سے محفوظ نہیں رہے گا۔ اس پیش منظر سے دنیا کے بڑے بڑے دانشور اور سیاستداں دہشت زدہ ہیں۔ امن وقت کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا ہے اور بدامنی سب سے بڑا واقعہ۔ پچھلی دو جنگیں، جنگوں کو فنا کرنے اور امن کو دوام بخشنے کے دعووں اور نعروں کے ساتھ برپا کی گئی تھیں۔ اسی مقصد کے لیے پہلے لیگ آف نیشنز، اس کے بعد یونائیٹڈ نیشنز کا قیام عمل میں آیا۔ مجلس اقوام دم توڑ چکی، اقوام متحدہ آخری سانس لے رہی ہے۔ بیسویں صدی کے

ختم ہونے میں تقریباً بارہ سال باقی رہ گئے ہیں۔ سوال ہے، کیا انسان بھی اس صدی کے ساتھ ختم ہو جائے گا؟

یہ سوال جدید انسان کے سر پر تلوار کی طرح لٹک رہا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ برٹرنڈ رسل کے لفظوں میں آج کا انتہائی ترقی یافتہ معاشرہ ایک ایسے بم پر بیٹھا ہوا ہے جو کسی وقت پھٹ جائے گا اور اس کے پھٹتے ہی معاشرے کے پرخچے اڑ جائیں گے، تہذیب و تمدن ملیا میٹ ہو جائیں گے اور اگر انسانی زندگی باقی رہی تو ایک نئے دور وحشت سے دوچار ہوگی، انسانیت کا قافلہ صدیوں پیچھے چلا جائے گا۔ اس بھیانک انجام سے بچنے کے لیے جنگوں کے اس وقفے میں جسے دور امن سمجھا جا رہا ہے آئے دن بین الاقوامی مذاکرات ہوتے رہتے ہیں، تخفیف اسلحہ کی بات ہوتی ہے، ناجنگ معاہدوں کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں، مختلف ممالک خطۂ امن کی تشکیل پر زور دیتے ہیں۔ بڑی طاقتوں کے حلقے، اہل مغرب کی تنظیمیں اور اہل مشرق کے ادارے سب اپنی اپنی جگہ گفت و شنید میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن مختلف کشتیوں سے امن کی جو فاختائیں اڑائی جاتی ہیں وہ لوٹ کر اپنی اپنی کشتی پر چلی آتی ہیں اور کسی کی چونچ میں شاخ زیتوں دکھائی نہیں پڑتی۔

اس نامرادی کا سبب یہ ہے کہ جو مقتدر اصحاب انسانیت کے چارہ ساز بنے ہوئے ہیں وہ حقائق کا مطالعہ کرنے کے لیے آمادہ نہیں، جنگ کے محرکات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں اور امن کی

مؤثر تدبیر کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، ہر ملک صرف دوسرے کو نصیحت کرتا ہے، ہر قوم محض اپنے مفاد کی فکر کرتی ہے، ہر طاقت فقط اپنے حلقۂ اثر کا تحفظ کرنا چاہتی ہے، اس لیے کہ انسانی اخوت کے عالم گیر اصول کسی کے سامنے نہیں، سب کے سب آفاقی قدروں سے نابلد ہیں اور بلند اخلاق سے آراستہ کوئی بھی نہیں۔ نہ کسی کا ذہن صاف ہے نہ کسی کا ضمیر روشن۔ مابعد صنعتی معاشرے کی باگ ڈور کم عقل اور بے کردار لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔

زمین سے اٹھ کر اب ستاروں میں لڑائی کی جو باتیں ہو رہی ہیں وہ بے پناہ مادی ترقیات پر مبنی ہیں۔ انسان کی خلائی پرواز اس وقت ممکن ہوئی ہے جب اس نے بحر و بر کی سطحوں اور تہوں کو چھان مارا ہے۔ فطرت کی بہت سی قوتوں کا راز پا کر آدمِ خاکی تسخیر عناصر کے خواب دیکھنے لگا ہے، مادۂ حیات کی تخلیق و تشکیل کی آرزو کرنے لگا ہے۔ مادی طاقت کی اس فراوانی نے آدمی کے دماغ پر اثر ڈالا ہے۔ مغربی دانشوروں کی ایک معتد بہ تعداد انسان سے برتر کسی وجود کی قائل نہیں، لہٰذا مذہب اس کے خیال میں ایک فرسودہ تخیل ہے اور اخلاق ایک بوسیدہ تصور۔ حکمت زمانہ کے اس انداز نے دنیا کی معیشت کو زندگی کا واحد نصب العین بنا دیا ہے اور معاشرت کا مقصد صرف لطف و لذت ہو کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ کسی اعلیٰ مطمح نظر کو چھوڑ کر صرف طرزِ رہائش کی بہتری کو تمام کوششوں کا نشانہ بنا لیا گیا ہے۔ تعلیم و تحقیق، علوم و فنون، سیاست و صنعت،

حتیٰ کہ دین کے نام پر ایک خاص قسم کے بظاہر راہبانہ تصوّف، کا مقصود زیادہ سے زیادہ عیاشی کے سامان فراہم کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ اس ایک مقصد کے لیے آج پوری دنیا میں طاقت غلبے اور اقتدار کی ساری کشاکش ہو رہی ہے اور مختلف ممالک ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے مہلک ترین ہتھیار بنانے یا خریدنے پر اپنی قومی آمدنی کا بیشتر حصّہ بے دریغ خرچ کر رہے ہیں، پھر لطیفہ اور المیہ یہ ہے کہ یہی ممالک امن کی رٹ بھی لگا رہے ہیں، دوسروں کو جنگ باز اور اپنے آپ کو بہت امن پسند بتا رہے ہیں۔ یہ ممالک مغرب میں بھی ہیں اور مشرق میں بھی، یورپ ہو یا امریکہ، ایشیا ہو یا افریقہ، جو ملک آبادی رقبے اور وسائل کے اعتبار سے جتنا بڑا ہے وہ اتنی ہی زیادہ مکاری فریب کاری اور خود پسندی اور خود غرضی سے کام لے رہا ہے۔ اس تناظر میں بڑی طاقتوں اور چھوٹی قوتوں کو جو چیز ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہونے سے روکتی رہی ہے وہ برٹرنڈ رسل کے الفاظ میں محض "دہشت کا توازن" (BALANCE OF TERROR) ہے، ہر قوم کا سربراہ فقط اس خوف سے اپنا جنگ کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ روک لیتا ہے کہ اگر اس نے دوسرے پر فوج کشی کا اقدام کیا تو جواب میں اس کی قوم کی تباہی کا سامان بھی اسی طرح ہو جائے گا جس طرح دوسری قوم کی بربادی کا۔

یہ ہے آج کا مابعد صنعتی معاشرہ جس سے عصر حاضر میں اسلام کو

سابقہ درپیش ہے۔ جدید ترقی یافتہ معاشرہ درحقیقت مذہبیت اور تمام مذاہب کے لیے ایک چیلنج بن کر سامنے آیا ہے، اس لیے کہ اس کے متعدد اقدامات نے الٰہیات اور اخلاقیات، مذہب کے فکری و عملی دونوں پہلوؤں پر ضرب لگائی ہے۔ چنانچہ ہر مذہب کے مخلص افراد اپنی اپنی جگہ نئے سماج کے مسائل سے پریشان ہیں اور ان کے حل کی تدابیر بھی سوچ رہے ہیں۔ لیکن اسلام کے سوا دیگر مذاہب کی مجبوری یہ ہے کہ ان میں سے کسی کے پاس نہ تو مستند دینی عقائد ہیں نہ ان عقائد پر عمل کرنے والی نمونے کی کوئی انسانی سیرت اور تاریخ۔ چنانچہ یہ مذاہب صرف اوہام و خرافات میں مبتلا اور محض اساطیر سازی اور کسی نہ کسی نوع کی اصنام پرستی میں محو ہیں۔ شاید انہیں اپنی اس خامی کا خود بھی احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ماننے والے زندگی کے عام میدان عمل سے ہٹ کر گرجاؤں، مٹھوں، خانقاہوں اور عبادت خانوں کے گوشوں میں پناہ گیر ہو چکے ہیں، انہوں نے دنیا کے معاملات میں دنیا پرستوں کی برتری تسلیم کر لی ہے اور اپنے آپ کو صرف دعا گوئی اور وظیفہ خواری تک محدود کر لیا ہے۔ دنیا پرستوں میں خدا پرستی کا دم بھرنے والے بھی رسمی عبادت گذاری اور وظیفہ خوانی سے آگے نہیں بڑھتے۔ انہوں نے اپنے دھرم اور ریلیجن کو دنیا سے الگ کر لیا۔ اور اپنی دنیا کو دھرم اور ریلیجن سے آزاد کر دیا ہے۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر بیسویں صدی میں انگریزی کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار

اور انشا پرداز، برناڈ شاہ نے اپنے سب سے بڑے ڈرامے "بیک ٹو میتھو صلاح" (BACK TO METHU SELAH) میں پیش گوئی کی کہ جدید انسانی معاشرے کی علمی، صنعتی اور تکنیکی ترقیات کی تاب اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب نہیں لا سکتا اور ترقی یافتہ انسان کو اگر کوئی مذہبی ضابطۂ حیات سنبھال سکتا ہے تو وہ صرف شریعت محمدی ہے۔ آرنلڈ ٹواین بی نے بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ اسلامی توحید وہ واحد تصور ہے جو آج کی بکھرتی ہوئی انسانیت کی شیرازہ بندی کر کے وحدت الٰہ اور وحدت آدم کی بنیاد پر ایک ایسی عالم گیر حریت، اخوت اور مساوات قائم کر سکتا ہے جو بین الاقوامی کش مکش اور آویزش کو بالکل ختم کر دے یہاں تک کہ ایک ہمہ گیر جنگ و ہلاکت کا خطرہ دنیا کے سر پر سے ٹل جائے۔

یہ تاریخی رول اسلام دور جدید میں اسی طرح ادا کر سکتا ہے جس طرح اس نے عہد قدیم میں ادا کیا تھا۔ چودہ سو سال قبل کے قرون مظلمہ میں ایک قدیم جاہلیت نے عربوں کو خانہ جنگی اور روم و ایران کی بڑی طاقتوں کو بین الاقوامی جنگ کی بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ آج کی دنیا میں ایک جدید جاہلیت نے تقریباً ہر قوم کو ایک قسم کی خانہ جنگی میں ڈال دیا اور تمام قوموں کو ایک آخری عالمی جنگ کے دہانے پر کھڑا کر دیا ہے جب کہ قوموں کی باہمی چپقلش مختلف خطوں میں موجودہ صدی کے آغاز ہی سے روز افزوں ہے۔ جن وجوہ سے یہ تنازع پیدا ہوا اور جاری ہے

حیاتیات، نفسیات اور معاشرت کے جدید نظریات نے انہیں لازمۂ حیات قرار دے کر ایک فطری و دائمی جہد للبقاء تسلیم کرلیا ہے۔

ڈارون کا نظریۂ بقائے اصلح، فرائڈ کا تصورِ جنس اور مارکس کا فلسفۂ اقتصادیات انسان کو حلقوں، صنفوں، اور طبقوں میں مستقل طور پر تقسیم کر کے ہر فردِ بشر کو دوسرے کا حریف قرار دے دیتا ہے لہٰذا افراد کے درمیان رفاقت کی کوئی بنیاد ذاتی مفاد پرستی یا گروہی معاملہ بندی کے سوا باقی نہیں رہ جاتی۔ اسلام نے نیابتِ الٰہی، شرافتِ انسانی، تعددِ ازدواج وطلاق اور دولت بحیثیت امانت کے اصلاحی و انقلابی تصورات پیش کر کے امن و اعتدال اور عدل و انصاف کی راہیں ہموار کر دی ہیں۔ ان تصورات میں مادیت و روحانیت کا توازن، دین و دنیا کی موافقت اور بنی آدم کے باہمی اشتراک و تعاون کی قدریں نمایاں ہیں۔ اسلامی عقائد کے مطابق نہ کوئی شخص فوق البشر ہو سکتا ہے، نہ کوئی صنف فقط علامتِ جنس بن سکتی ہے، نہ کوئی طبقہ دوسرے طبقات کا آمرانہ استحصال کر سکتا ہے۔ خیر البشر کا نمونہ ہر فرد و جماعت کو بندۂ خدا، خادمِ خلق، ایک دوسرے کا غمگسار اور چارہ ساز بنانے کا سامان کرتا ہے، اس طرح جس کی جو جائز خواہش، ضرورت اور آرزو ہے وہ دوسرے کسی کی خواہش، ضرورت اور آرزو کا خون کیے بغیر پوری ہو جاتی ہے، اس لیے کہ اس کی تکمیل میں ہر ایک دوسرے کا بہی خواہ اور معاون ہوتا ہے، بدخواہ اور مزاحم نہیں، جیسا کہ میکانکی و حیوانی ارتقاء، جنسیاتی نفسیات اور اشتراکیت کے

تحت ہوتا ہے۔ اسلامی تصورِ توحید انسان اور انسان کے درمیان تمام تفرقوں کو ختم کر کے ایک آفاقی معاشرہ تشکیل دیتا ہے، جس کے افراد آپس میں کسی قسم کے تضاد کے بجائے مطابقت کی نسبت رکھتے ہیں۔ اس تصور کے مطابق انسان کے اندر انسانیت، نہ کہ حیوانیت جاگزیں ہے۔ مرد و زن ضدّین نہیں، زوجین ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ متعدد رشتوں میں بندھے ہوئے ہیں، امیر و غریب کے درمیان دولت کا فرق کوئی طبقاتی نزاع نہیں پیدا کرتا بلکہ معیشت کے کاروبار اور معاشرت کی سرگرمیوں میں ایک کو دوسرے کا ضمیمہ اور تتمّہ بناتا ہے، اختلاف فطری ہے جبکہ مخالفت مصنوعی، لہٰذا مختلف عناصر کو ایک دوسرے کا مخالف بننے کے بجائے معاون بن کر کام کرنا ہے۔

اس اشتراکِ عمل میں دونوں کے اپنے اپنے مقدر کی تعمیر مضمر ہے۔ دراصل توحید اگر مذہب کا نقطۂ آغاز ہے تو سائنس کا نقطۂ عروج۔ چنانچہ تمام سائنسی ترقیات جس منزل کی طرف پیش قدمی کر رہی ہیں وہ کائنات و حیات میں ایک اصولِ وحدت کا سراغ لگانا ہے۔ موجودہ صدی کی پہلی چوتھائی میں آین اسٹاین کا ریاضیاتی نظریۂ اضافیت اس صداقت کا علمبردار بن کر سامنے آیا اور اس نے انیسویں صدی کی سائنس سے رونما ہونے والی مادہ پرستی پر ایک کاری ضرب لگائی۔ لیکن یہ نظریہ اضافت تک پہنچ کر رک گیا۔ اس کے ارتقا کی اگلی منزل لازماً وحدت ہے، جس کی جستجو کا اعلان موجودہ صدی کی آخری چوتھائی میں نوبل انعام یافتہ سائنسدان

جناب عبد السلام نے کیا ہے۔ فی الواقع جدید سائنس کے سب سے ترقی یافتہ شعبے، نیوکلیو فزکس، کا مطلب ہی یہ ہے کہ عالم طبعی میں کوئی مرکز ہے جس کی تلاش مقصودِ حکمت ہے۔ یہ مرکزِ عالم ذات باری تعالیٰ کی خلاقی ہی کا وہ کرشمہ ہو سکتا ہے جو کائنات کی تمام ترقیات کا منبع اور اساس ہے۔ اس طرح ممکن اور متوقع ہے کہ مابعد صنعتی معاشرہ بالآخر اپنے علم و عقل اور تجربے سے بھی رب العالمین کی وحدانیت کا وہ نکتہ دریافت کرلے جو اسلام اور صرف اسلام کا کلمۂ ایمان ہے، اس لیے کہ یہودیت، عیسائیت، بودھ مت، ہندو دھرم سب کے سب شرک و کفر یا دہریت و الحاد میں مبتلا ہیں، اسی لیے انگریز عیسائی مورخ، ٹو، این، بی نے اقرار کیا ہے کہ آج توحید صرف اسلامی معاشرے میں موجود ہے، جب کہ مسیحی معاشرہ تثلیث کا شکار ہے۔

اسلام کا عقیدۂ رسالت اس کے عقیدۂ توحید کے مطابق ہے۔ قرآن مسلمانوں کو اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے، اس لیے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے پہلے، اکیلے اور انوکھے رسول نہیں ہیں۔ اللہ کے رسول پہلے انسان، حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے ہر دور، ہر خطے میں آتے رہے ہیں، وہ سب ایک ہی دین کے مبلغ تھے جس کا نام اسلام ہے، اور اسلام کائنات کی تمام مخلوقات جمادات، حیوانات اور پوری نوع انسانی کا واحد فطری اور حقیقی دین ہے، جس کی شریعتیں صدیوں تک مختلف ادوار و مقامات میں وحی کے ذریعے انبیا و رسل کو دی جانے والی کتابوں میں نازل ہوتی رہیں۔ اس طرح دنیا کے

ساتھ ساتھ دین کا ارتقا بھی ہوتا رہا، یہاں تک کہ جب انسان اپنے بلوغ کو پہنچ گیا اور تاریخ کی پوری روشنی میں آگیا تو خدا کی قدرت و مشیئت نے دینِ اسلام کی تکمیل شریعتِ محمدی سے کردی اور اپنے آخری رسولؐ کو انسانیت کا نمونۂ کامل بنا دیا، پھر اس پر نازل ہونے والی کتاب 'قرآن مجید' کو وحیِ الٰہی کا آخری اور مکمل اڈیشن قرار دیا، جس میں پچھلے رسولوں پر نازل ہونے والی تمام آفاقی و اصولی تعلیمات جمع کردی گئی ہیں، زندگی کی ہر ضروری اور بنیادی حقیقت کی تشریح و تفصیل کردی گئی ہے، اور نہ صرف اللہ کے کلام کو بالکل محفوظ کردیا گیا بلکہ جس ذات پر یہ کلام نازل ہوا اور جس نے اس پر عمل کرکے دکھایا اس کی سنت و سیرت کا بھی ایک ایسا ریکارڈ مرتب کرا دیا گیا جس کی صحت کو جانچنے کے لیے ایک معیار مقرر کردیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے آخری رسولؐ نے ایک ایسا معاشرہ قائم کیا اور ایک ایسی ریاست تشکیل دی جو انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے قیامت تک ایک نمونۂ عمل ہے، یہی سب سے روشن، سب سے کشادہ اور سیدھا منزل کی طرف جانے والا واحد جادۂ حیات ہے، جبکہ اس کے چاروں طرف بے شمار ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں اور اندھیری گلیاں انسانیت کے قافلے کو بھٹکانے کے لیے بکھری پڑی ہیں۔

جس طرح اللہ تعالیٰ رب العالمین ہے اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحمت للعالمین ہیں۔ خدا تعالیٰ تمام عالم کا پروردگار ہے اور خدا کے آخری رسولؐ تمام عالم کے لیے رحمت ہیں۔ وہ کسی ایک فرقے، علاقے، قبیلے، طبقے

اور حلقے کے نہیں، دنیا کے تمام انسانوں کے رسول بلا کسی امتیاز کے ہیں، آپ کی لائی ہوئی شریعت محض مسلمانوں کا پرسنل لا نہیں ہے، پوری انسانیت کا ضابطۂ حیات ہے، آپؐ کی سیرت ہر فرد و بشر کے لیے اخلاق و کردار کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہے۔ ختم رسالت انسانی فکر کی آزادی کا پروانہ بھی ہے۔ اقبال نے اپنے بصیرت افروز خطبات (فکر اسلامی کی تشکیل جدید) میں یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی بعثت نے نظام حیات کی اس درجہ تکمیل کر دی کہ اب خدا کی طرف سے نہ دوسرا کوئی رسول آئے گا نہ دوسری کوئی وحی نازل ہوگی، لہٰذا انسانی فکر کی کارگزاریوں میں اب براہ راست خدا کی جانب سے کوئی دخل نہیں دیا جائے گا، بلکہ انسان آزاد ہے کہ اپنے تفکر و تدبر سے کام لے کر ارتقا کی اگلی منزلوں کی طرف بڑھتا چلا جائے، بس اسے حدود اللہ کے اندر رہ کر خدا اور رسول کے واضح احکام و ہدایات سے ہموار کیے ہوئے صراطِ مستقیم پر گامزن رہنا ہے، ان حدود کی پابندی کرکے اِس شاہراہ پر قدم بڑھاتے ہوئے، وہ تسخیرِ کائنات اور ارتقاءِ حیات کے لیے جو بھی چاہے کر سکتا ہے اور ترقی کی آخری حد تک پہنچ سکتا ہے، جو اس سے کم کوئی چیز نہیں ہے کہ بندہ خدا کے قریب پہنچ کر رضائے الٰہی کا حصول کرے۔

انسانیت کے اس فروغ و عروج ہی پر معراج النبیؐ کا عظیم الشان اور بے مثال واقعہ دلالت کرتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۂ النجم کی متعلقہ آیات کو ملا کر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شب رسول کریم

علیہ الصلوٰۃ والتسلیم چند لمحات کے اندر مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں میں تمام سیاروں اور ستاروں سے گذر کر، سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور حیات و کائنات کے عمیق ترین حقائق کا مشاہدہ کر کے روئے زمین پر لوٹ آئے۔ یہ بہترین اور عظیم ترین انسان کے ہاتھوں فتح کائنات کا واقعہ ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بندۂ خدا (عبدہٗ) نظام کائنات کی آخری سرحد تک جا سکتا ہے۔ احادیث میں اس واقعے کی تفصیلات پر غور کرنے سے آشکارا ہوتا ہے کہ خاتم الانبیاء اور ختم الرسل کو معراج کے سفر پر لے جانے سے پہلے آپؐ کا سینۂ مبارک چاک کر کے اس میں نورِ معرفت بھر دیا گیا اور جس سواری پر آپؐ نے سیاحت علوی کی وہ برق سے مشتق "بُراق" نام کی سواری تھی۔ عصرِ حاضر میں انسان کی خلائی پرواز آواز سے زیادہ تیز رفتار راکٹوں کے ذریعے ہو رہی ہے، مگر بلند تر فضاؤں کی سیر، بالخصوص ستاروں کی سیاحت، اس وقت ممکن ہے جب روشنی اور بجلی کی رفتار سے چلنے والے جہاز ایجاد ہو جائیں۔ معراج کی سواری 'براق' اس ایجاد کے امکان کی طرف ایک اشارہ ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ کیا روحانی قوت کے بغیر جسم انسانی اتنی تیز رفتار کا متحمل ہو سکتا ہے؟

اس سوال کا کوئی جواب نورِ معرفت کے سوا ممکن نہیں۔ نورِ رسالت کا پرتو ایک صاحب ایمان پر پڑ سکتا ہے اور رسول اللہؐ کے نشانِ قدم پر چل کر ایک بندۂ خدا توفیق الٰہی کے مطابق ستاروں سے آگے جا سکتا ہے

اس طرح مادی و روحانی طاقتوں کا توازن ہی وہ کلید ہے جو زمین پر بسنے والے انسان کے لیے آسمانوں کے بند دروازے کھول سکتی ہے۔ لیکن اس توازن کے حصول کی شرط رسولِ آخر الزماںؐ کی شریعت کی پابندی اور ان کی سیرت کی پیروی ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے آفاق و انفس کی آیات کا تجسس اور تتبع کرنے کی جو ہدایت کی ہے اس پر ایمان کی پوری بصیرت و جرأت کے ساتھ عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ ایک کارِ گراں ہے جو حوصلہ مند اور اولوالعزم اہلِ ایمان ہی بہترین شعور و کردار کے ساتھ انجام دے سکتے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ اس مہم کی مشکلات کا اندازہ کر کے ہی دنیا کے سب سے بڑے شاعر اور بیسویں صدی کے سب سے زیادہ تیز نگاہ فلسفی اقبالؔ نے، جنہیں دورِ جدید کے عظیم ترین مفکر علامہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے "اکابر مفکرین اسلام" میں شمار کیا ہے، اپنے آخری مجموعۂ کلام "ارمغانِ حجاز" کے ایک فارسی قطعے میں ارشاد کیا:

بہ نورِ تو برافروزم نگہ را
کہ بینم اندرونِ مہر و مہ را
چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لاالٰہ را

(اے رسولِ کریم! آپؐ کے نورِ نبوت سے اپنی نگاہ روشن کر کے چاند اور سورج کے اندر کی دنیا دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن جب اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں، اس لیے کہ میں کلمۂ اسلام لاالٰہ الااللہ

محمد رسول اللہ کی مشکلات سے واقف ہوں)

حقائق کی اس تشریح سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا نظریۂ ارتقاء کیا ہے ؟ یہ یقیناً ڈارون کا وہ مادہ پرستانہ، حیوانی و میکانکی ارتقاء نہیں ہے جس کے مطابق مادہ ایک خودکار عمل کے ذریعہ ترقی کرتا ہوا، ایک عضویاتی تسلسل کے ساتھ، جمادات اور حیوانات کی مختلف و متنوع اشکال سے برآمد ہو کر انسان کی صورت میں آ گیا ہے اور آئندہ جرمن فلسفی نطشہ کے خیال میں فوق البشر کی پیدائش کا باعث ہوگا۔ اس بے مہار ارتقاء میں جرمن فلسفی ہیگل کی فکری جدلیات کی جو تعبیر مارکس نے جدلیاتی مادیت یا مادی جدلیات کی صورت میں پیش کی ہیں اور اس کی بنا پر پوری تاریخ انسانی کا ایک خالص اقتصادی تجزیہ سرمایہ و محنت کی کش مکش کی شکل میں کر ڈالا ہے اس کا بھی کوئی تعلق اسلام سے نہیں ہو سکتا۔ قرآن صریحاً ایک تخلیقی ارتقاء کا تصور پیش کر کے حیات و کائنات کی الوہی و اخلاقی ترقی کی طرف واضح اشارے کرتا ہے۔ منشاء خداوندی کے مطابق آدم کی تخلیق اور خدا کے بخشے ہوئے علم کے سبب ملائکہ پر انسان کی فضیلت کے واقعات بجائے خود تصریح کرتے ہیں کہ اسلامی اصول ارتقاء کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے، الگ الگ، جمادات اور حیوانات کی تخلیق کر کے پہلے ایک دنیا بسائی، تب اس نے روئے زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر انسان کو تمام قویٰ اور اختیارات کے ساتھ ایک منصوبے کی تکمیل کے لیے بھیجا اور اپنے احکام کی بجا آوری کے لیے اس کے فرائض کی پہچان ایک

پیمان ازل کے طور پر انسان کے ضمیر میں ودیعت کر دی۔ اس کے علاوہ شیطان کے ساتھ انسان کا تصادم کرا کے حکمت الٰہی نے واضح کر دیا کہ دنیا ایک رزم گاہِ خیر و شر ہے اور ارتقائے حیات کی ساری پیکار حق و باطل کے درمیان بالکل اخلاقی سطح پر ہو گی۔

اقبال نے ''بانگ درا'' کی ایک نظم ''ارتقا'' میں یہی نکتہ ایک علامتی انداز سے بیان کیا ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

خیر و شر اور حق و باطل کی آفاقی کش مکش میں خیر کی قوت بن کر شر پر غالب آنا اور زندگی کو ذہنی و اخلاقی ترقی کی اگلی منزلوں کی طرف بڑھانا دنیا میں ملتِ اسلامیہ کا وہ مشہورِ عالم نصب العین ہے جس کی ترجمانی قرآن حکیم نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کی ہے۔

اس نصب العین کی پیش رفت ہی وہ کائناتی امانت ہے جس کا بار پہاڑوں، زمین اور آسمانوں کے عاجز رہ جانے کے بعد، انسان نے روزِ ازل سے ابد تک کے لیے اٹھا رکھا ہے۔ خاتم المرسلین کو اس انسانی مشن کی تکمیل کے لیے جن عظیم و جلیل مقاصد کے ساتھ مبعوث کیا گیا وہ قرآن کے مطابق یہ ہیں:

۱۔ آیاتِ الٰہی کی تبلیغ،

۲۔ تزکیۂ نفوس،

۳۔ تعلیم کتاب،
۴۔ تعلیم حکمت

یہ سب مقاصد باہم مربوط اور ایک دوسرے سے بالکل ہم آہنگ ہیں، ان میں سے کسی ایک کو بھی چھوڑ کر وہ اخلاقی ارتقا ممکن نہیں جسے انسان کا مقدر بنایا گیا ہے۔ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنی رسالت کے ۲۳ برسوں میں یہ چاروں کام بہ یک وقت اور یکساں طور پر کیے۔ آپؐ نے اپنے اوپر نازل ہونے والے احکام و حقائق کو اجزائے قرآن کی شکل میں بہ تمام و کمال اہل دنیا اور عالم انسانیت تک پہنچا دیا، اس کے ساتھ ہی آپؐ نے انسانوں کی کردار سازی کی، ان کی سیرتوں کو تمام آلودگیوں سے پاک وصاف کر کے انہیں بڑی سے بڑی مہمات سر کرنے اور خدمات انجام دینے کے قابل بنا دیا، اس کے علاوہ آپؐ نے کتاب اللہ کے احکام و ہدایات کی مسلسل تشریح و تدریس اپنے قول و فعل دونوں سے کی، سب سے بڑھ کر حضورؐ نے ایک ایک حکم و ہدایت کی حکمت لوگوں پر واضح کر دی اور انہیں دعوتِ قرآنی کی روشنی میں حیات و کائنات کے تمام مظاہر پر پیہم غور و فکر کی تلقین کی، تاکہ وہ مشیتِ الٰہی کو سمجھ کر منشا خداوندی کے مطابق اپنے افعال و اعمال، ایک ایک حرکت اور ہر قسم کی سرگرمی سے رضائے الٰہی کے حصول کی سعی کریں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے حکمت کو خیر کثیر اور رسوخِ علم کو باعثِ ایمان نیز معیارِ تقویٰ قرار دیا۔

یہ ایک مثالی زندگی کا نقشہ ہے جس پر عمل کے لیے ایک مثالی معاشرہ

درکار ہے۔ ریاست مدینہ کے دورِ رسالت، اوراس کے بعد قائم ہونے والی خلافت راشدہ کے دوران میں، تقریباً نصف صدی کے لیے ایک نمونے کی انفرادی واجتماعی زندگی کا نقشہ دنیا نے انسانیت کو دکھا دیا گیا۔ اب تاریخ کے ہر دور اور جغرافیہ کے ہر خطے میں تمام افراد پوری نوع نوعِ انسانی کا امتحان یہ ہے کہ وہ کس حد تک اس نمونے پر اپنی زندگی کو ڈھال سکتے ہیں۔ اس امتحان میں کامیابی کے لیے ایک مکمّل معاشرتی ضابطہ (CIVIL CODE) قرآن وسنت کی روشنی میں مرتب ہوکر موجود ہے۔ فقہ اسلامی (ISLAMIC JURISPRUDENCE) اس ضابطے کی نشاندہی کرتی ہے، اگرچہ فقہ میں اجتہاد اوراس کے نتیجے میں تجدیدِ حیات اورحلِ مسائل کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ سماج کے اندر پیدا ہونے والے نئے نئے معاشرتی سوالات کا جواب ماہرینِ قانونِ اسلامی قرآن وسنّت کی وضاحتوں کی روشنی میں شرعی قیاس واجتہاد سے کام لے کر علمائے دین اور ملّت اسلامیہ کے اجماع کے ساتھ، بخوبی دے سکتے ہیں۔ اس طرح اسلامی معاشرہ حدوداللہ کے اندر ترقی کرتا ہوا ہمیشہ تازہ دم رہ سکتا ہے اوراپنے افراد کو میدانِ ارتقاء میں پیش قدم رکھ سکتا ہے۔

کیا موجودہ مسلم معاشرہ مابعد صنعتی زندگی کے تقاضے پورے کرسکتا ہے اور کیا وہ اسلام کا مثالی معاشرہ ہے؟ یہ سوال ہمارے موضوع سے بہت زیادہ تعلق نہیں رکھتا۔ ہم اسلامی نصب العین کی بات کررہے ہیں، نہ کہ آج کے مسلمانوں کی اور صاف بات یہ ہے کہ اگر عصرِ حاضر کے

مسلمان مثالی یا معیاری مسلم و مومن ہوتے تو وہ سوال ہی نہیں اٹھتا جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں۔ اس سوال کا مطلب ہی یہ ہے کہ موجودہ مسلم معاشرہ اسلامی نقطۂ نظر سے ناقص اور خام ہے۔

لیکن خدا کا دین مسلمانوں کا محتاج نہیں ہے، البتہ مسلمان اپنی آبرومندانہ زندگی اور ترقی کے لیے خدا کے دین کے محتاج ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کی تاریخ یہ بتاتی ہے مسلمان جب کبھی دنیا میں آگے بڑھے ہیں تو اسلام کو لے کر اور جب پیچھے ہٹے ہیں تو اسلام کو چھوڑ کر۔ حکمت خداوندی نے کبھی اسلام سے الگ ہو کر مسلمانوں کو دنیا میں پنپنے کا موقع نہیں دیا ہے، حالانکہ یہودی اور عیسائی یا دیگر مذاہب کے ماننے والے صدیوں سے اپنے اپنے مذہب کو اپنے اجتماعی معاملات سے علیحدہ کر کے ہی دنیوی ترقی حاصل کرتے رہے ہیں۔ اس صورت حال کی وجہ ظاہر ہے۔ اسلام کی شریعتِ محمدی انسان کے نام خدا کا آخری پیغام ہے اور ملت اسلامیہ اس پیغام کی حامل ہے، جبکہ دوسرے تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں اور ان سے وابستہ افراد کوئی دوسرے تمام مذاہب دینی ملّت نہیں ہیں، لہٰذا اہلِ اسلام کا مقدر و مستقبل تو صرف اسلام پر منحصر ہے، مگر دیگر ملتیں دین سے بیگانہ ہیں اور چند روزہ دنیوی عیش کی حد تک لادینی ہی انہیں راس آسکتی ہے۔ یہ واقعہ نوع انسانی کے تمام افراد بالخصوص اہلِ ایمان کے لیے باعثِ امتحان ہے۔

عصرِ حاضر میں اسلام کو ایک بار پھر تاریخ انسانی میں اپنا انقلابی و

و اصلاحی رول ادا کرنے کے لیے ایک اسلامی معاشرے کی ضرورت ہے۔
یہ معاشرہ اسلامی اصولوں کے تحت روئے ارض پر کہیں بھی برپا ہو سکتا
ہے۔ ماضی میں مسلمانوں کے مراکزِ اقتدار جس طرح بدلتے رہے ہیں اس سے
ایک سبق ملتا ہے۔ خلافت عباسیہ کے کمزور ہونے کے بعد فاطمیوں،
سلجوقیوں، عثمانیوں اور مغلوں کا عروج یہ بتاتا ہے کہ اسلام کی تقدیر
عرب و ایران کے ساتھ وابستہ نہیں، مصر و شام اور ترکی و ہندوستان
کے آفاق پر بھی ہلالِ اسلام اسی طرح طلوع ہوتا رہتا ہے جس طرح حجاز و
عراق کے آفاق پر۔ سب سے زیادہ سبق آموز واقعہ تو وہ ہے جس کی طرف
اقبال نے اشارہ کیا ہے:

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

چنانچہ جنگ عظیم کے اوّل زمانے میں جب روس کا اشتراکی انقلاب
برپا ہوا اور مذہبی و معاشی و سیاسی اداروں میں عیسائیوں، سرمایہ داروں
اور شہنشاہیت پرستوں کے لات و منات توڑ دیے گئے نیز عام حریت
اور اخوت و مساوات کے نعرے لگائے گئے تو اقبال نے دورِ جدید میں اسلامی
اقدار کی علمبرداری کے لیے روس سے توقع وابستہ کی، مگر جلد ہی وہ اشتراکی
دہریت، استبداد اور سامراج سے نالاں ہو گئے، چنانچہ جنگ کے بعد
انہیں امریکہ آج کی دنیا کے پردے پر ایک نئی اخلاقی قوت بن کر ابھرتا نظر
آیا، جیسا انہوں نے "پیام مشرق" (۱۹۲۲ء) کے دیباچے میں اشارہ

کیا ہے۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ وہ امریکہ سے بھی مایوس ہو گئے اور وفات سے کچھ عرصہ قبل جو انھوں نے اپنی آخری بڑی نظم اردو میں "ابلیس کی مجلس شوریٰ" کے عنوان سے لکھی اور وہ ان کے بعد از مرگ مجموعے "ارمغان حجاز" میں شامل کی گئی اس کے ذریعہ انہوں نے بادشاہت، جمہوریت، سرمایہ داری اور اشتراکیت سبھی نظریات پر تنقید کر کے ان سے تعلق رکھنے والے معاشروں کو رد کر دیا، جبکہ ابلیس کی زبان سے انہوں نے اس اندیشے کا اظہار کرایا:

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

ٹوائن بی نے CIVILIZATION ON TRIAL (تہذیب دورِ آزمائش میں) میں اقرار کیا ہے کہ توحید کا وہ تصور جو آج بھی انسانیت کی آخری امید ہے تمام خرابیوں کے باوجود ابھی تک مسلم معاشرے میں ہی جلوہ گر ہے، جہاں انسان کو انسان سے جدا کرنے والے رنگ و نسل اور علاقہ و طبقہ کے بے جا امتیازات کم از کم اصولی طور پر نہیں پائے جاتے اور نماز پنجگانہ سے حج تک دنیا بھر کی مساجد میں اور خانۂ کعبہ کے گرد، تمام اہلِ ایمان صف باندھ کر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے ہو جاتے اور قدم سے قدم ملا کر عبادت اور طواف کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی رزم گاہ میں مسلم ممالک فوجی اہمیت کے اکثر مقامات پر قابض ہیں، وہ اقوام عالم کو ملانے والی شاہراہوں کے دونوں طرف بسے ہوئے ہیں، اور بہترین لڑنے

والی نسلیں ہنوز اسلام کے آغوش میں ہیں۔ لہٰذا ایک ترقی یافتہ بین الاقوامی دور کو جو عالمی معاشرہ اور عالمی حکومت مطلوب ہے اس کے بنیادی وسائل و مواقع اہلِ اسلام کو حاصل ہیں۔ اب ان وسائل و مواقع سے کام لے کر ایک پرامن اور عالمگیر ما بعد صنعتی معاشرہ قائم کرنے اور اس کے تحفظ ترقی کے لیے ایک عالمی حکومت تشکیل دینے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے وہ دنیائے اسلام میں ایک مضبوط و متحرک اور موثر نظریاتی جماعت ہے، جو مسلم آبادی کے کسی بھی خطے میں ابھر کر آج کی انسانیت کی بین الملّی اور بین الاقوامی تنظیم کر سکتی ہے۔ یہی تنظیم انسان کو کائنات میں ارتقائے حیات کی اگلی منزلوں اور آخری سرحدوں تک لے جائے گی، اس کے ذریعے بیک وقت اور یکساں طور پر اسلام اور انسانیت دونوں کی نشاۃِ ثانیہ ہوگی، خدا کے دین کے ہمہ گیر غلبے کا قرآنی وعدہ پورا ہو جائے گا اور بندۂ خدا کے قریب پہنچ کر آخرت کا دائمی انعام حاصل کرلے گا۔